© rasailojaraid.com

فلسفہ کیا ہے؟

(۲)

از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم اے، پی، ایچ، ڈی پروفیسر جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن

فلسفہ اور سائنس

کہا جاتا ہے کہ فلسفہ اور سائنس کے درمیان ہمیشہ جنگ رہی ہے۔ ہم موجودہ نقطۂ نظر سے ان کے باہمی تعلق پر روشنی ڈالیں گے، اختصار ہمارے پیشِ نظر ہوگا۔ فلسفہ اور سائنس میں نہایت قریبی تعلق ہے، دونوں کا مبدء و ماویٰ وہی ایک ہے، "حبِ علم" ان کی ابتدا اور "علمِ حقیقت" ان کا منتہا ہے۔ اب یہ خیال صحیح نہ رہا کہ فلسفیانہ نظامات بغیر مادی علوم کی احتیاج کے تشکیل پا سکتے ہیں۔ فلسفہ اور سائنس کا تعلق اس قدر قریبی ہے کہ فلسفے کا طالب علم علومِ مخصوصہ خصوصاً ریاضیات، طبعیات، کیمیا، حیاتیات اور نفسیات کے کسی قدر علم کو لابدی سمجھتا ہے۔ لیکن ان علوم کا دائرہ ہر روز وسیع ہوتا جا رہا ہے اور ان تمام پر عبور حاصل کرنا کسی کے لئے آسان نہیں، اسی لئے فی زماننا فلسفہ اپنی توجہ زیادہ تر کلیات کی ناقدانہ تحلیل اور قیمتوں اور معانی کے مطالعہ پر مبذول کر رہا ہے۔ تاہم صحیح صحیح معنی میں فلسفی تو وہی ہوگا جو تمام علوم مخصوصہ پر مہارت رکھتا ہو۔

سائنس (یا حکمت) لاطینی لفظ ہے جو 'علم' کے ہم معنیٰ ہے، حکیمانہ علم "متیقن، صحیح، اور پوری طرح مربوط و منضبط ہوتا ہے"۔ فلسفہ بھی دنیا کے متعلق علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لہٰذا فلسفہ اور سائنس دونوں کا ایک ہی مقصد ہوگا۔ لیکن ان دونوں میں فرق ضرور ہے، اور بعض دفعہ اس فرق کو اس طرح ادا کیا گیا ہے کہ سائنس کا کام واقعات کا "بیان" *Describe* کرنا ہے اور فلسفے کا کام ان کی "توجیہ و تعبیر"

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(Interpretation.) ہے ارتھر ٹامسن نے پیرسن اور دوسرے علمائے سائنس کا تتبع کرتے ہوئے سائنس کی اس طرح تعریف کی ہے کہ:-

"سائنس واقعاتِ تجربیہ کا سادہ سے سادہ الفاظ میں کامل و متوافق بیان ہے"۔

مظاہرِ عالم کے ایک مجموعے کا عالمِ سائنس مطالعہ کرتا ہے، وہ سب سے اول متعلقہ واقعات کو جمع کرتا ہے، پھر ان کی تعریف و تحلیل کرتا ہے، ان کو ترکیب دیتا ہے، پھر ان کا اصطفاف کرتا ہے، پھر ان شرائط (یا علل) کا مطالعہ کرتا ہے جن کے تحت یہ وقوع پذیر ہو رہے ہیں ان کی یکسانیتِ عمل کا تعین کرتا ہے یعنی ان کے قوانین کو دریافت کرتا ہے اور آخر میں ان کو ایک مربوط و مرتب مقالے کی صورت میں پیش کرتا ہے اور یہاں پر اس کا کام بحیثیت عالمِ سائنس کے ختم ہو جاتا ہے یعنی اس نے واقعاتِ تجربیہ کا سادہ الفاظ میں کامل و منضبط بیان پیش کر دیا۔ ان کے طرزِ وقوع و طریقۂ عمل کو سمجھا دیا۔ سائنس کی اسپرٹ برخلاف عملی و جذباتی پہلو کے مندرجۂ ذیل خصوصیات سے متصف ہوتی ہے:-

ا۔ واقعات اور صداقت کی بے غرضانہ تلاش۔

ب۔ تجربے کی طرف مسلسل توجہ

ج۔ بیان میں حزم و احتیاط

د۔ بصیرت کی صفائی۔

ہ۔ اشیاء کے باہمی ربط کا خیال۔

اب فلسفہ بھی سائنس کی طرح اسی علم کا متلاشی ہے جو متیقن، صحیح اور مربوط و منضبط ہو لیکن وہ محض اسی علم پر قانع نہیں، وہ اس علم کا جویا ہے جس میں جامعیت اور استیعاب ہو۔ مظاہر کے غیر مبدّل توالیات، یا قوانین کا تعین ذہنِ انسانی کی پوری طرح تشفی نہیں کر سکتا۔ وہ اشیاء یا واقعات کی انتہائی توجیہ و تعبیر کا خواہاں ہوتا ہے یعنی وہ ان کی علتِ اولیٰ، ان کی بدائت و غائت، ان کے معنی یا قدر و قیمت کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جویا ہوتا ہے۔ سائنس محض واقعات کے وقوع کے شرائط یا انکا بیان پیش کرتی ہے لیکن فلسفہ ان کی انتہائی توجیہ یا تشریح کرنا چاہتا ہے، زمانۂ حال کے ایک زندہ سائنٹفک فلسفی نے اسی چیز کو اچھی طرح ادا کیا ہے "فلسفہ مختلف علوم وسائنس کے نتائج کو لیتا ہے اور ان کے ساتھ انسان کے مذہبی واخلاقی تجربات کے نتائج کو ملاتا ہے اور پھر ان پر بحیثیت مجموعی غور وفکر کرتا ہے۔ امید یہ ہوتی ہے کہ ہم اس طریقے سے کائنات کی کنہ وماہیت اور خود اپنی حیثیت ومقام کے متعلق بعض عام نتائج حاصل کر سکیں"۔ (براڈ)

اس میں شک نہیں کہ فلسفے کے اس عظیم الشان مقصد کے حصول کی خواہش پر اس کی عالمگیر وسعت ہی کی بنا پر علمائے سائنس کی جانب سے اعتراضات وارد ہوتے ہیں کہ یہ کام دیوتاؤں کا ہے ضعیف البنیان انسان اس کو حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کا تفصیلی جواب ہم آگے چل کر پیش کرنے کی کوشش کریں گے لیکن یہاں صرف اتنا کہنا ضروری ہے کہ "کل" کو سمجھنے کی کوشش بذاتِ خود موردِ اعتراض نہیں بن سکتی، کیونکہ انسان کو اس سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے اور انسانی دلچسپی کا ہر معروض حکیمانہ تحقیقات کا موضوع بن سکتا ہے بشرطیکہ حکیمانہ طریقے استعمال کئے جائیں۔ اعتراض تو اسی وقت وارد ہو سکتا ہے جب غلط طریقے استعمال کئے جائیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اوائل میں منطقی طریقوں کا استعمال فلسفے کے مطالعے کے وقت نہیں کیا گیا، لیکن ہم آگے چل کر بتائیں گے کہ خود سائنس کے مطالعے میں بھی منطقی طریقوں کا استعمال گزشتہ زمانوں میں نہیں کیا گیا۔ فکلاھما سواء

بہر حال طریقوں کی بحث چھوڑ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلسفے کے دو جداگانہ مقاصد ہیں اور دونوں سائنس کے عمل سے مختلف ہیں اور دونوں فکرِ انسانی کی جائز ضروریات ہیں۔ اولاً دنیا من حیث کل پر اور خصوصاً اس کے معنی مقصد یا غایت اور قدر وقیمت پر غور وفکر۔ ثانیاً ان تصوراتِ کلی کا ناقدانہ امتحان جو سائنس اور فہمِ عام کے استعمال میں آتے ہیں پہلے کو "فلسفۂ نظری" کہا گیا ہے اور دوسرے کو "فلسفۂ انتقادی"۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقصدِ اول کے متعلق ہمیں خوب یاد رکھنا چاہیے کہ ذہنِ انسانی کی یہ عمیق ترین خواہش ہے کہ دنیا اور زندگی کے متعلق وہ نقطۂ نظر حاصل کیا جائے جو فلسفے کے لئے مخصوص ہے ہمیں دنیا کا محض ایک کمی نقطہ نظر یا محض اس کے ریاضیاتی علایق ہی کا علم درکار نہیں بلکہ اس کی ماہیت یا کیفی و باطنی خصوصیات اور "اسرارِ ازل" کا علم مطلوب ہے اس زمانے میں سائنس کے دائرہ میں جتنی بھی تحقیقات ہو رہی ہیں ان سب میں کمی علایق پر زور دیا جا رہا ہے۔ سب 'کیف' کے جواب سے قاصر ہیں، کمیت کی ناپ تول اور تحقیق و تدقیق جاری ہے۔ حکیمانہ نقطہ نظر سے سائنس کی یہ تحدید کوئی نقص نہیں کہ وہ کیفیت اور معنی و قیمت کے سوال کو اپنے دائرۂ بحث سے خارج سمجھتی ہے۔ لیکن اس کا تکملہ فلسفے سے کیا جانا چاہیے ممکن ہے کہ دنیا میں نہ مقصد ہو نہ غایت، اور نہ اس کی قدر و قیمت ہی کچھ ہو۔ لیکن اس نتیجے تک بھی ہم فکر و نظر کی ایک غیر معمولی و مستقل کوشش ہی کے بعد پہنچ سکتے ہیں اور اسی غور و فکر کا نام فلسفہ ہے۔

مقصدِ دوم (تصورات کی ناقدانہ تحلیل) کے متعلق ہم یہاں صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ سائنس اور فہم عام کے بعض ایسے کلی تصورات ہیں جن کی وہ پوری طرح جانچ پڑتال نہیں کرتے بلکہ محض عملی تعریف کرنے کے بعد اپنے عملی مقاصد کے حصول کے لئے ان کا استعمال شروع کر دیتے ہیں۔ اس قسم کے تصورات کی مثال مکان و زمان، کیفیت و کمیت، علیت و قانون، خیر و شر وغیرہا سے دی جا سکتی ہے اب فلسفے کا یہ مخصوص کام ہے کہ ان تصوراتِ کلیہ کا پوری طرح امتحان کرے، ان کی ناقدانہ تحلیل کرے۔ بقول جی آر تھامسن کے "مقولات (تصورات) و مسلمات کی یہ تنقید وہ اہم خدمت ہے جو مابعد الطبیعات سائنس کے حق میں بجا لاتی ہے"۔

برٹرنڈ رسل وغیرہ نے اسی کام کو فلسفے کا واحد وظیفہ قرار دیا ہے۔ ان دنوں یہ نہایت اصطلاحی چیز ہو گئی ہے اور ہم سرِ دست اس میں داخل ہونا نہیں چاہتے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فلسفہ اور مذہب

ہم فلسفہ اور مذہب کے باہمی تعلق پر اس لئے غور کر رہے ہیں کہ فلسفے کی اہمیت اور اس کی افادیت اور زیادہ واضح اور اُجاگر ہو جائے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ فلسفہ اور مذہب میں بیر ہے۔ واقعہ اس کے خلاف ہے، مندرجہ ذیل مختصر واقعات سے آپ خود اس کا اندازہ کر سکیں گے۔

فلسفہ اور سائنس میں جس قسم کا تعلق تبلایا گیا، اس سے فلسفہ اور مذہب کا تعلق جداگانہ ہے فلسفہ کائنات من حیث کل کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، یہ دنیا کے متعلق سائنس سے زیادہ جامع، کامل اور وحدت بخش علم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن مذہب کو اس سے بھی زیادہ کامل وحدت کی تلاش ہے، فلسفہ ایک ایسے تصور کی تلاش کرتا ہے جو ہماری مضطرب عقل کو دنیا کے معنے سمجھا دے۔ لیکن مذہب فرد اور عالم کی حقیقی وحدت اور ان کے وفاق کو جاننے کی کوشش کرتا ہے، مذہب میں ہماری کوشش مبدءِ عالم کے ساتھ ایک ہو جانے کی ہوتی ہے، ہم اس میں محو ہو جانا چاہتے ہیں اور اس طریقے سے اس کی معرفت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

کہا گیا ہے کہ مذہب کا کام انسان کو دنیا میں طمانیتِ نفس و جمعیتِ خاطر بخشنا ہے لیکن سائنس اور فلسفہ بھی ہمارے علم میں پہنائے عالم پیدا کرنے اور لذتِ وقوف بخشنے کی وجہ سے قلب میں ایک خاص قسم کی طمانیت پیدا کرتے ہیں۔ سائنس، فلسفہ اور مذہب یہ تینوں دنیا کو جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں، یہ ان کی غایتِ مشترکہ قرار دی جا سکتی ہے، لیکن اس علم سے ان کی غرض جداجدا ہے۔ سائنس کی غرض علم کو علم ہی کی خاطر حاصل کرنا ہوتی ہے۔ لیکن زیادہ تر یہ علم کو عملی و اقتصادی اغراض کے تحت رکھتی ہے۔ فلسفے کی غرض محبتِ علم اور اس سے پیدا ہونے والی ذہنی طمانیت و لذت ہوتی ہے مذہب، کائنات کو اس لئے سمجھنا چاہتا ہے کہ روحِ انسان کو جمعیت، چین اور نجات حاصل ہو۔ بعض

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وقت فلسفہ اور مذہب ان ہی تصورات سے بحث کرتے ہیں۔ مثلاً روح، اس کی ہدایت وغایت خدا اور تخلیق، لیکن یہاں بھی ان دونوں کے اغراض جدا جدا ہوتے ہیں۔ اول الذکر میں یہ نظری اور عقلی ہیں اور ثانی الذکر میں یہ جذبی اور شخصی!

فلسفہ نظر وفکر کرنے والے ذہن کا نتیجہ ہوتا ہے، فرد اس میں "فکر" کی وجہ سے حصہ لیتا ہے لیکن مذہب پر وہ "ایمان" رکھتا ہے، یہ اس کا اپنا ذاتی معاملہ ہے، کسی کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ مذہب زندگی کے وہبی، جذباتی وحسی میلانات کی گہرائیوں میں اپنی جڑیں جمائے ہوئے ہوتا ہے فطرتِ انسانی کا یہ پہلو ابتدا ہی سے عادات ووجدانات میں مضبوطی پکڑ لیتا ہے اور اس میں کسی قسم کا تغیر وتبدل پیدا کرنا سخت مشکل ہوتا ہے۔

لیکن آخر مذہب کیا ہے؟ اگر اس کی تعریف ناممکن ہے تو کسی قدر معنی کا تعین تو ضرور ہوسکیگا مذہب پر جب آپ غور کرتے ہیں تو شاید ائتلاف کی وجہ سے مسجد وحرم، دیر وکلیسا، مصلّے وناقوس، تسبیح وزاہد، خیال میں آتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ چیزیں ضروری طور پر مذہب تو نہیں۔ اب مذاہبِ عالم پر نظرِ غائر ڈالیں اور ان کے اجزائے مشترکہ پر غور کریں تو ہم مذہب کی کسی تعریف تک پہنچ سکیں گے، شاید وہ کچھ اس قسم کی ہو "مذہب غیب کی ان قوتوں پر آسرا کرنے کے احساس کا نام ہے جن کی قدرت میں ہماری قسمت کی باگ ہے، ساتھ ساتھ ان قوائے غیبی سے صادقانہ تعلقات قائم کرنے کی خواہش بھی ہوتی ہے"[1] یا مذہب ایک غیر مرئی روحانی نظام سے ہمارے عملی تعلق کا شعور ہے"

"مذہب ہمارے باطن کے اعلیٰ ترین جوہر کے ساتھ وفاشعاری کا احساس ہے"

امیرسن نے خوب کہا ہے کہ "میں، ناقص 'میں' اپنے کامل 'میں' کی پرستش کرتا ہوں" ان تعریفات سے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کی بنیاد اعلیٰ قیمتوں کے عمیق جبلّی احساس پر ہوتی ہے۔ ہماری ذات میں جو

---

[1] جے، بی، پراٹ کی کتاب Religious-Consciousness. صفحہ ۱ مطبوعہ میکملن کمپنی ۱۹۲۰ء

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الہیت کا جوہر مکنون و مستتر ہے وہ اس جوہر الٰہی کی طرف بڑھتا ہے جو ہم سے ماورا ر سارے عالم پر محیط ہے یا مذہب ان ہی اعلیٰ و انتہائی قیمتوں کی طرف اس خاک و باد کی دنیا اور اس کے آلام ولذائذ سے بلند ہو کر دیکھنا اور ان کی طرف باطنی ہمدردی اور شناخت کی وجہ سے کھنچ جانا ہے۔ اسی بنا پر ونٹ نے کہا ہے کہ "ہم ان احساسات یا تصورات کو مذہبی کہیں گے جو ایک نصب العینی وجود کی طرف اشارہ کرتے ہیں" اسی وجہ سے مذہب کے اسمار، علائم واشخاص پاک و مقدس سمجھے جاتے ہیں، یہ برترین قیمتیں ہیں۔ دنیا کی معمولی و ادنیٰ چیزوں سے ماورا ہیں، اور اسی لئے مذہبی پہلو وفا شعاری، تحریم، تواضع و زہد کا ہوتا ہے۔

مذہب کی اس تعریف کے لحاظ سے روح، روحانی یا روحانیت کے الفاظ میں کسی قسم کا سر و غموض نہیں پایا جاتا۔ یہ ان چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں جن کی اعلیٰ قیمتیں ہوتی ہیں چنانچہ جارج سینٹا کہتا ہے کہ روحانی ہونے سے مراد "نصب العین کے حضور میں زندگی بسر کرنا ہے"۔ ڈریک نے اپنی کتاب "مسائل مذہب" میں روحانیت کے معنی اور مذہب سے اس کے تعلق کو بڑی اچھی طرح ظاہر کیا ہے:۔

> "قلب و ارادے کا وہ میلان جس کی وجہ سے انسان اعلیٰ چیزوں کی پروا کرتا اور رفق و ملائمت و طمانیت باطنی کے ساتھ زندگی بسر کرتا اور حیات کے سطحی واقعات سے متاثر نہیں ہوتا اپنی باطنی ماہیت کے لحاظ سے "روحانیت" کہلاتا ہے، اور جب یہ خارجی صورتوں اور اداروں میں رونما ہوتا ہے اور تمام جماعتوں میں پھیل جاتا ہے تو ہم اس کو "مذہب" کہتے ہیں"۔ [1]

اس طرح پر سمجھا جائے تو پھر مذہب کوئی غامضانہ، تحکمانہ، یا پُر اسرار شئے نہیں رہتا بلکہ وہ

---

[1] "مسائل مذہب" صفحہ ۲۴۴۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایک حاجتمند روح کی جبلی آواز بن جاتا ہے۔ مذہب انسان کی جبلت میں داخل ہے، وہ ایسی چیز نہیں جس کی صداقت پر ہم معترض ہوں یا اس کی شہادتیں تلاش کی جائیں۔ اس کی بنیاد تو اس امر پر ہے کہ ہم اعلیٰ اقدار یا قیمتوں کے دائرہ حکومت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور ان سے ایک قسم کی جبلی ہمدردی رکھتے ہیں اور ان کے آرزومند ہوتے ہیں۔ اور چونکہ مذہب ان اعلیٰ اقدار کو ہمیشہ ہماری نظروں کے سامنے رکھتا ہے اور ان کو دنیا کے لذائذ ور غائب کے باوجود فراموش ہونے نہیں دیتا، اس لئے مذہب انسان کی زندگی میں سب سے زیادہ خوبصورت شے ہے۔

مذہب اور فلسفے کا تعلق کتنا قریبی ہے وہ اس بیان سے واضح ہو گیا ہوگا۔ کیونکہ اگر مذہب کی یہ تعریف کی جائے کہ یہ ان روحانی اقدار یا قیمتوں کا استحکام ہے جو روحِ انسانی میں ہمیشہ موجود ہوتی ہیں۔ لیکن بعض اوقات خفتہ حالت میں ہوتی ہیں، تو پھر فلسفے کا یہ کام ہوگا کہ وہ ان قیمتوں کی تحقیق کرے، ان کے مبدء وماخذ کا پتہ چلائے، ہم نے ابتدا میں فلسفے کی تعریف ہی یہ کی تھی کہ فلسفہ "معانی اور قیمتوں کے مطالعہ کا نام ہے" اور اگر مذہب روحِ انسانی کا کائنات کی اعلیٰ قوتوں کو لبیک کہنا ہے تو فلسفے کا کام یہ ہوگا کہ ان الٰہی قوتوں کے وجود کے دلائل و براہین پیش کرے، یا اگر مذہبی پہلو کے لئے اس امر کا یقین کرنا کسی طرح ضروری ہے کہ اشیاء کے پس پردہ کوئی الٰہی قوت ہے جو فطرتِ انسانی سے کوئی نہ کوئی شے مشترک رکھتی ہے جس کو ہم نہایت احتیاط کے ساتھ شخصی کہہ سکتے ہیں تو فلسفے کا یہ فریضہ ہوگا کہ اس امر کا تعین کرے کہ سائنس یا ما بعد الطبیعیات میں کوئی ایسی چیز تو نہیں جو ہمیں اس شخصی قوت کے وجود پر یقین کرنے سے باز رکھے، یا اگر سائنس یا ما بعد الطبیعیات میں کوئی وجہ اس پر یقین کرنے کی ملتی ہے تو وہ کیا ہے؟

یہ اکثر دریافت کیا جاتا ہے کہ فلسفیانہ تعلیم کا مذہب پر کیا اثر پڑتا ہے؟ ہمارے خیال میں یہ اثر نہایت مفید ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ابتدائً فلسفے کا مطالعہ ہمارے بعض مذہبی عقائد وخیالات میں کسی قدر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خلل پیدا کرے، خصوصاً جبکہ ہمارے یہ عقائد بالکل کوتاہ اور ناقابلِ مصالحت ہوں۔ لیکن اگر یہ وسیع کشادہ اور سادہ ہوں تو فلسفہ ان کی تائید کرتا اور انھیں تقویت بخشتا ہے۔ بیکن نے کہا ہے کہ "یہ صحیح ہے کہ تھوڑا سا فلسفہ انسان کے ذہن کو الحاد کی جانب مائل کرتا ہے لیکن فلسفے میں تعمق انسان کے ذہن کو مذہب کی طرف رجوع کر دیتا ہے"۔

دراصل فلسفے کا یہ کام ہے کہ وہ ہمارے اساسی مذہبی اذعانات کو عقل کی "بنیانِ مرصوص" پر مستحکم طور پر قائم کر دے تاکہ جبلّی تیقنات اور "دین العجائز" مادیت والحاد کے طوفان میں غرق نہ ہو جائیں بعض دفعہ ہمارے ان جبلّی احساساتِ مذہبی میں ارتعاش ہوتا ہے اور ہمیں خوف ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ "نجس" سائنس ہمارے ان اذعانات کو برباد کر دے۔ فلسفہ ہمیں پہاڑ کی چوٹی پر لے جاتا ہے اور ہم وہاں سے شک وریب کی وادی پر نظر ڈالتے ہیں، علم سے ہمیں قوت حاصل ہوتی ہے خوف رفع ہو جاتا ہے، جس چیز کو ہم نے بدترین سمجھا تھا وہ اپنے پورے خدوخال، پورے تناسب میں کچھ بری نہیں معلوم ہوتی، پھر ہمیں جو طمانیت وسکون حاصل ہوتا ہے وہ ابدی ہوتا ہے۔

فلسفے کے امکان کا سوال

فلسفے کو شاعری، سائنس اور مذہب کے تقابل سے آپ نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ دیکھا "فلسفیانہ مسئلہ" یا موضوع کو شکل کیجئے تو اس کی وسعت سے آپ کو ایک قسم کا خوف یا تحیر ہو گا حقیقت کی کنہ یا ماہیت، کائنات کے معانی ومقصود، اس کی بدائت ونہایت، حیات کی قدر وقیمت یہ ایسے عظیم الشان سوالات ہیں کہ ان کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا اور کسی قسم کا حل پیش کرنا بڑی ہمت کا کام ہے! عالمِ سائنس جو دنیا کے ایک گوشہ کو لینا اور اس کو پوری طرح سمجھنے میں اپنی تمام قوتوں کو صرف کر دیتا ہے وہ فلسفی کے دائرۂ بحث کے پھیلاؤ اور کشادگی کو دیکھ کر کہہ اٹھتا ہے کہ یہ کام دیوتاؤں کا ہی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انسان کا نہیں کیوں کہ ؎

من می نگرم ز بندی تا استاد عجز ست بدست کہ از ما درزاد (خیام)

لیکن خود یہ عالم سائنس جانتا ہے کہ اس کا دائرۂ بحث کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو دوسرے علوم کے دوائر سے کچھ اس طرح مربوط ہے کہ خواہ مخواہ اس جزو کے کامل علم کے لئے "کل" کا مطالعہ ضروری ہو اور اس طرح وہ مجبوراً فلسفے ہی کے دائرہ میں قدم زن ہوتا ہے، یا کم از کم فلسفی پر اعتراض کرنا ترک کر دیتا ہو تاہم مفکرین کے بعض گروہ ایسے گزرے ہیں جنھوں نے فلسفیانہ مسائل کی وسعت سے گھبراکر اس کے مطالعہ ہی سے انکار کر دیا ہے، ان میں سے ہم دو کا اختصار کے ساتھ ذکر کریں گے۔ ایک ایجابیت اور دوسری ارتیابیت۔

ایجابیت

فرانس کے فلسفی اگسٹ کانٹ (۱۷۹۸ئہ تا ۱۸۵۷ئہ) نے دنیا کے متعلق اپنے نقطۂ خیال کا نام ایجابیت رکھا ہے، گو حقیقت میں یہ خود فلسفی ہے جو فکر کی مستقل اور غیر معمولی کوشش کے بعد دنیا کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر تک پہنچا ہے لیکن وہ فلسفے کے نام سے بیزار ہے۔ اس کا یقین تھا کہ علت العلل یا علت اولیٰ، آخری یا انتہائی حقیقت اور اس قسم کے ساری چیزوں کی تلاش محض فضول ہے۔ انسان کے ذہن کی رسائی ان حقائق تک نہیں ہو سکتی، وہ تجربے کے واقعات یا مظاہر اور ان کے توافقِ عمل یا قوانین ہی تک محدود رہتا ہے۔ ظواہر کے پسِ پردہ کیا ہے اور اشیائے کماہی کی حقیقت و ماہیت کیا ہے، یہ سب مابعد الطبیعاتی تجریدات ہیں، ان سے احتراز ہی مفید ہے، فلسفے کا کام ظواہر کے باہمی تعلقات اور ان کے غیر متبدل طریقِ رفتار کا دریافت کرنا ہے نہ کہ تجریدی تصورات کے گورکھ دھندوں میں الجھنا!

کانٹ کی ساری دلچسپی عمرانیات ہی سے تھی، وہ اپنے کو اس علم کا موجد سمجھتا تھا۔ اس کا نصب العین سوسائٹی کی اصلاح تھی، اس نصب العین کا تحقیق معاشرت کے قوانین کے علم ہی سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہو سکتا ہے، لہذا کانٹ معاشرت کا سائنٹفک طریقوں سے مطالعہ کرنا چاہتا تھا اور اسی کو وہ فلسفۂ جدیدہ قرار دیتا تھا۔ اس لئے ایجابیت کا مطلب صرف اتنا ہوا کہ سائنس فکرِ انسانی کی آخری منزل ہے اور سائنس کا مقصد وحید واقعات تجربیہ کے باہمی مستقل علائق اور ان کے قوانین دریافت کرنا ہے اور یہ مشاہدہ اور تجربے ہی سے ممکن ہے۔ سائنس ان چیزوں سے بحث کرتی ہے جو تیقن و مفید اور قطعی ہوتی ہیں اور خصوصاً جو ہمارے معاشری اداروں کی تکمیل کے لئے مفید ہوتی ہیں، یہ علم ایجابی ہے اسی کی تدوین ایجابیت کا کام ہے۔

سائنس کی قدر و قیمت کے متعلق ہر شخص کو کانٹ کے ساتھ اتفاق ہو گا، نیز علومِ معاشریہ کی اہمیت کے متعلق بھی کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا، لیکن کیا ہم اُس کے اس خیال کے ساتھ اتفاق کر سکتے ہیں کہ فلسفے کے وسیع مسائل کا مطالعہ فضول ہے اور ما بعد الطبیعات پر وقت صرف کرنا رائیگاں؟ اس کی تحقیق آگے آتی ہے۔

ارتیابیت

دوسرا گروہ جو ہمیں فلسفے کی منزلِ مقصود کی طرف قدم اٹھانے سے باز رکھتا ہے وہ ارتیابیہ کا ہے۔ خیام کی زبان میں کچھ اس طرح ہم اس مسلک کو ادا کر سکتے ہیں ؎

دورے کہ درو آمدن و رفتنِ ماست　　　او را نہ نہایت و بدایت پیدا ست
کس می نہ زند دمے دریں معنی راست　　　کیں آمدن از کجا و رفتن بکجا ست

ارتیابیت کا ظہور پہلے یونان میں سوفسطائیت کے دور میں ہوا۔ غورجیاس کی تعلیم سفسطہ کا نمونہ ہے "کسی شے کا وجود نہیں، اگر وجود ہے تو ہمیں اس کا علم نہیں، اگر اس کا علم بھی ہے تو یہ دوسروں تک نہیں پہنچایا جا سکتا" ہستی کا انکار، علم کا انکار، اس سے زیادہ انکار و ارتیاب کیا ہو سکتا ہے؟ چند دن بعد یونانی رومی دور میں ارتیابیت فلسفے کا ایک مستقل "اسکول" بن گئی، جس کا بانی "پرہو" تھا تعجب تو یہ ہے کہ ان مفکرین نے سقراط، فلاطون، ارسطو، دمقراطیس جیسے جلیل القدر فلسفیوں کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بعد جنم لیا، اور گو اہلِ یونان نے اب تک مابعد الطبعیات، اخلاقیات، منطق، ریاضیات میں شاندار کامیابیاں حاصل کی تھیں تاہم انھوں نے "پردۂ محمل" تک پہنچنے میں مایوسی کا اظہار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ اب تک فلسفہ ادعائی تھا، ذہنِ انسان نے ملکۂ علم کی تنقید کے بغیر یہ مان لیا تھا کہ حقیقت کا علم ممکن ہے۔ لہذا یہ اکابر فلاسفہ کے مختلف و متضاد خیالات و نظریات کا ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے اور ان کا مذاق اڑایا کرتے اور کہتے کہ عقدۂ کائنات لاینحل ہے، صداقتِ کلی ناقابلِ حصول۔ ہاں "انسان (فرد) ہر چیز کا معیار ہے"۔ "جتنے آدمی اتنے ذہن" ہماری رایوں میں یکسانیت ممکن نہیں، لہذا علمِ کلی کا امکان بالکل نہیں۔ فرد علم کے معاملے میں اپنا قانون آپ ہے۔ اس نظری ارتیابیت سے اخلاقی ارتیابیت بہت زیادہ دور نہیں تھی۔ جب علم ہی کا امکان نہیں تو صواب و خطا کا علم کہاں۔ کلی طور پہ صواب و خطا کا وجود نہیں، جو چیز تمہارے لئے اچھی ہو ضروری نہیں کہ وہ میرے لئے بھی اچھی ہو۔ ضمیر شخصی معاملہ ہے، یہی حال جمال کا ہے۔ اس میں بھی کوئی مشترک معیار نہیں۔ کیا تمہیں اس حبشی کا قصہ یاد نہیں جو اپنے بادشاہ کے اس حکم کی پیروی میں کہ سب سے زیادہ حسین بچے کے گلے میں موتیوں کا ہار پہنایا جائے بہت سی تلاش کے بعد اپنے ہی بچے کے گلے میں پہنا دیا اور عرض کیا کہ جہاں پناہ میری نگاہ میں اس حبشی زادہ سے زیادہ خوبصورت آپ کی ساری وسیع مملکت میں کوئی بچہ نہیں!

زمانۂ جدید میں یونان کی سی ارتیابیت بالکل مفقود ہے۔ ارتیابیت کا سب سے آخری حامی اڈنبرا کا مشہورِ عالم مفکر ہیوم تھا۔ (۱۷۱۱ء تا ۱۷۷۶ء) لیکن اس کی ارتیابیت ایسی تباہ کن اور انتہائی نہ تھی جیسی کہ یونانی ارتیابیت، بلکہ یہ حدودِ علم کی ایک ناقدانہ تحقیق و تدقیق تھی۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ہمارے علم کا مبدء تجربہ ہے، اس کی انتہا عالمِ مظاہر، اور ایک قسم کی "لاادریت" کہ علل انتہائی، روح، ایغو، وغیرہ کی حقیقت کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں۔

موجودہ زمانے کی اسپرٹ تو یہ ہے کہ جدید مسئلہ کا امید و رجا کے ساتھ بہم مقابلہ کیا جائے،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فلسفیوں کا باہمی اختلاف ممکن، علم انسانی کی غلطی ممکن، ہمارے حواس کا التباس ممکن، لیکن ہم یہ ضرور دریافت کر کے رہیں گے کہ کونسا فلسفہ صحیح ہے، حواس کا دہوکہ کس طرح دور کیا جا سکتا ہے، علم کی غلطی کیسے رفع ہو سکتی ہے۔ زمانۂ جدیدہ کی روح جرأت و جوش سے مملو ہے، قطب جنوبی کی دریافت کا بیڑہ اٹھایا، تلاش میں جانیں گئیں، لیکن باوجود ہر طرح کے آفات و مصائب کے اس کو دریافت کر ہی لیا۔ مونٹ ایورسٹ کی چوٹیاں ابھی زیرِ قدم نہیں آئی ہیں۔ لیکن اہلِ ہمت اس کی طرف بڑھے جا رہے ہیں ایک نہ ایک روز یہ زیرِ قدم آ رہیں گی۔ یونیورسٹی کی شرکت کے وقت طلباء ان مضامین کو زیادہ پسند کرتے ہیں جن میں مسائل زیادہ دریافت طلب ہوں۔ موجودہ فکر و تفلسف میں شک ضرور پایا جاتا ہے لیکن یہ ہمیں لوری دیکر بسترِ راحت پر نہیں سُلا رہا ہے بلکہ اقبال کی زبان میں کہہ رہا ہے:-

ضمیرِ کن فکاں غیر از تو کس نیست نشانِ بے نشاں غیر از تو کس نیست
قدم بے باک تر نہ در رہِ زیست بہ پہنائے جہاں غیر از تو کس نیست

براؤننگ کہتا ہے کہ "شک کی میں قدر کرتا ہوں، حیوانات میں یہ نہیں پایا جاتا۔ ان کی محدود مٹی میں اس شعاعِ مستنیر کی تابناکیاں کہاں؟" برٹرنڈ رسل اس رہا کن آزادی بخش "شک" کا ذکر کرتا ہے جو ادعائیت کو پست ہمت کرتا اور ہمیں راہِ عمل میں جری بناتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "فلسفہ ان لوگوں کی مفتخرانہ ادعائیت کو دور کرتا ہے جو آزادی بخش شک کے دائرہ میں قدم زن ہوتے ہیں، یا نوس اشیاء کو غیر مانوسیت کے جامہ میں پیش کر کے ہمارے احساسِ تحیّر کو ہمیشہ زندہ رکھتا ہے" ان جری روحوں کو ان بزدلوں سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں ہو سکتی جو محض اس خیال سے کہ چونکہ فلسفیانہ سوالات کے جواب نہیں دیئے جا سکتے۔ لہذا ان کو اٹھایا ہی نہ جائے اور نہ ان کے حل کی کوشش کی جائے۔ فلسفے کی راہ میں طالب علم کو شک بلکہ دہشت ضرور ہوتی ہے۔ لیکن شک کا پیدا کرنا، صداقت کی تلاش میں آوارہ و سرگرداں ہونا اور اس کے حصول کی امید رکھنا۔ یہ روحِ انسانی کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان دنوں ہم ارتیابیت کی بجائے "لاادریت" کا زیادہ ذکر سنتے ہیں۔ اس لفظ کو سب سے پہلے ہکسلے نے رواج دیا لیکن یہ ہربرٹ اسپنسر کے نام سے زیادہ تر وابستہ ہے، اس کے لفظی معنی ہیں "علم کا نہ ہونا" لاادری یعنی میں نہیں جانتا۔ اسپنسر کا یقین تھا کہ علم میں ایک قسم کی اضافیت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا علمِ مطلق کا امکان نہیں، سارا علم اضافی ہے۔ قانونِ اضافیت کے معنی یہ ہیں کہ کسی شے کا علم دوسری خارجی اشیا کے امتیاز سے حاصل ہوتا ہے جو اس کی تحدید کرتی ہیں۔ نیز یہ شے ذہن کی اضافت و تعلق ہی سے معلوم ہوسکتی ہے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ہمیں مظاہری، محدود، اضافی اور مشروط موجودات کا علم ہوگا۔ لامحدود اور مطلق یا غیر مشروط ہمارے دائرۂ علم سے ماورا، غیر معلوم و ناقابلِ علم ہوگا۔ چنانچہ اسپنسر کے نزدیک ہمارا علم مادہ حرکت قوت اور شعور وغیرہ جیسے واقعات کے ماورا نہیں پہنچ سکتا اور یہ سب کی سب ایک "ناقابلِ علم ہستیِ مطلق" کے شئون و احوال ہیں۔

قانونِ اضافیت پر تھوڑی دیر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قانون خود ذاتِ مطلق کے تصور کو ضروری سمجھتا ہے، یعنی اضافی کے تصور میں مطلق کا تصور استلزامی طور پر موجود ہوتا ہے۔ اور خود ہربرٹ اسپنسر نے اس کو تسلیم کرلیا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اگر دنیا محض ظہور ہے تو یہ ضرور کسی ہستی کا ظہور ہوگی، ظہور خود حدِ اضافی ہی جو کسی ہستی کے وجود کو مستلزم ہے، اسپنسر کا کہنا صرف یہ تھا کہ مطلق کے محض وجود کے سوا ہمیں اس کے متعلق کسی شے کا علم نہیں، لیکن اسپنسر کی اس غلطی کو ہیگل نے پہلے ہی رفع کردیا تھا۔ چونکہ تمام محدود اشیا، واذہان ذاتِ مطلق کے ظہور ہیں لہٰذا وہ ان ہی میں اور ان ہی کے ذریعہ قابلِ عمل ہے، اس میں شک نہیں کہ ذاتِ مطلق کی ماہیت ہمارے محدود ذہن میں پوری طرح نہیں آسکتی لیکن ہم اس کو ایک حد تک ضرور جزی طور پر سمجھ سکتے ہیں اور اس کی کچھ صفات سے واقف ہوسکتے ہیں۔ لہٰذا لاادریت کا یہ دعویٰ کہ جس قسم کے علم کی فلسفے کو تلاش ہے وہ ناقابلِ حصول ہے، شک سے بڑھ کر ادعائیت کی حد تک پہنچ جاتا ہے، لہٰذا یہ سائنس اور فلسفہ ہر دو کی اسپرٹ کے خلاف ہے۔ جو ان تھک اور دائمی تلاش کا نام ہے "فلسفی یا "عاشقِ حکمت" "آزارِ جستجو" ہی کو اپنی غایت سمجھتا ہے اور اقبال کی زبان میں کہتا ہے ؎

شادم کہ عاشقاں را سوزِ دوام دادی　　درماں نیافریدی آزارِ جستجو را

(باقی)

© rasailojaraid.com